



جیلانی بانو

(پیدائش: 1933)

جیلانی بانو کا اصل وطن بدایوں (اتر پردیش) ہے۔ ان کے والد حیدرآباد (آندھرا پردیش) جا کر بس گئے اور یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔

جیلانی بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ ”روشنی کے مینار“ 1958 میں شائع ہوا۔ ”نروان“ اور ”گن“ ان کے دوسرے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ انھوں نے کئی ناولٹ بھی لکھے جن میں ”جگنو اور ستارے“ اور ”نغمے کا سفر“ کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے دو ناول ”ایوان غزل“ اور ”بارش سنگ“ بہت مقبول ہوئے۔

جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں کا اصل موضوع حیدرآباد کے زوال کے بعد جاگیرداروں کی بکھرتی ہوئی زندگی ہے۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت ہے۔ اس کے علاوہ وہ حیدرآباد کی مخصوص بولی کا استعمال بھی بڑی چابکدستی سے کرتی ہیں۔



5019CH09

دوشالہ

آخر سرور کے سمجھانے بچھانے سے اتناں جان کا دل ہار ہی گیا۔ اُن کا دل جواب اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ مدافعت کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ اور وہ دن آن پہنچا کہ ان کا ٹوٹا پھوٹا صندوق رسیوں سے جکڑا دالان میں رکھا تھا۔ سرور نے اس کے اوپر سُتلی سے بندھا ہوا بستر، ایک لوٹا، ناشتے دان اور پان دان لاکر رکھ دیا تھا۔ بہونے انھیں اپنا پرانا بُرقع ٹھیک ٹھاک کر کے دے دیا۔ اس عمر میں انھیں اپنا چاند سا چہرہ چکانے کے لیے اب سیاہ برقع کی تو ضرورت نہ تھی۔

گھسی ہوئی آدھی آدھی سلیم شاہی جوتیاں انگوٹھوں میں اٹکائے وہ سارے گھر میں سٹر پٹر کرتی پھر رہی تھیں۔ اپنی سٹھیائی ہوئی یادوں کو اکٹھا کر کے بار بار سوچتیں کہ ابھی کون کون سی چیزوں کی اٹھا دھری کرنی ہے؟ اُن پر وہ وحشت سوار ہو چکی تھی جو سفر کا آغاز ہوتی ہے۔

ادھر اُنھوں نے کمرے سے باہر قدم رکھا ادھر ان کا پوتا تو قیر اور اس کی بہن جمال کوٹھری کا جائزہ لینا شروع کر دیتے تھے۔ وہاں کی ہر چیز اماں جان کے کام کی تھی۔ مکڑی کے جالے بھرے، ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر پر وہ مایا کا سانپ بنی بیٹھی تھیں۔ جمال محض انھیں ستانے کے لیے اگر زمین پر سے پان کا ڈٹھل بھی اٹھا لیتی تھی تو وہ چونک پڑتیں۔

”اے بیٹا کیا لیے جائے ہے۔ وہ میرے کام کی ہے۔“ اب انھیں دور سے سوجھائی تھوڑی دیتا تھا۔ بس یوں ہی الل ٹپ کہہ دیتیں۔

”یہ پان کا ڈٹھل بھی۔۔۔؟“ جمال بُرا مان کر دکھاتی۔۔۔

”دیکھوں۔۔۔“ وہ اس کی ہتھیلی اپنی آنکھوں سے لگا کر یقین کر لیتیں۔

”مگر تجھے ہر چیز اٹھانے کا لپکا کیوں ہے۔۔۔؟“

ان کا جی ڈوب جاتا تھا۔ ان بچوں کی وجہ سے تو ہر وقت ان کی گردن پر تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں اپنے پوتے اور پوتی سے نفرت ہو۔ مگر جن کے پاس دولت ہو اس کا دل تو دھڑکا ہی کرتا ہے۔ ہر طرف ڈاکوؤں کے پڑاؤ نظر آتے ہیں۔ ان کے چار بڑے لڑکے ایک لڑکی سمیت پاکستان سدھار چکے تھے۔ ایک سرور تھا کہ کلر کی پر قناعت کیے، باپ دادا کی اس پرانی

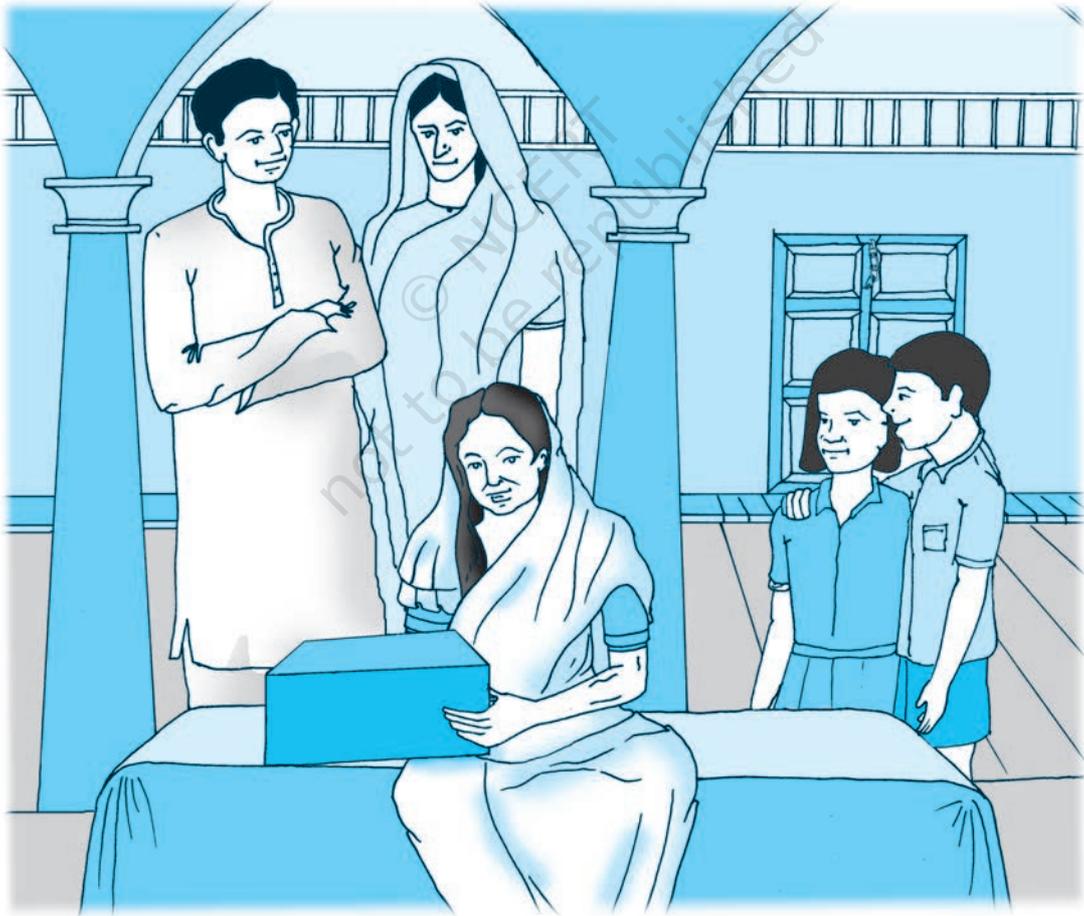
حویلی میں چراغ جلا رہا تھا۔ اس حویلی کی بھی اماں جان کی طرح کمر جھک چکی تھی اور دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ دراصل سرور کی بیوی نہ چاہتی تھی کہ وہاں بھی چار جھڑانیاں اور ایک ساس ہر وقت اُسے بہو بہو پکار کر اس کی گردن بھکائے رکھیں۔ مگر اماں جان گھر نہ چھوڑنے کے بہانے اب بھی آنکس سنبھالے اس کی گردن پر سوار تھیں۔

ویسے گھر سے مراد اب صرف ان کی گھڑیا تھی۔ جوں جوں گھر پر بہوؤں اور ان کی اولاد کا قبضہ ہوتا گیا وہ پیچھے ہٹتی گئیں۔ یہاں تک کہ اب اس ٹپکتی چھت کی سیلی کوٹھری پر ان کی اجارہ داری رہ گئی تھی، وہاں انھوں نے ہر وہ چیز جمع کر رکھی تھی جو ان کی بہوؤں کے خیال میں پھینک دینے کے قابل تھی۔ وہاں ان کی زندگی کے سارے ٹوٹے پھوٹے زنگ آلودہ کل پڑے پڑے تھے۔ ٹوٹے ہوئے فانوس کے رنگین ٹکڑے۔ زندگی بھر ساری تقریبوں میں سیبے جانے والے کپڑوں کی کترینیں۔ اُن بچوں کے کھلونے جن کے بچے بھی اب کھلونوں سے نہیں بہلائے جاسکتے۔ یہ سب دولت انھوں نے لکڑی کے صندوقوں میں اتنی احتیاط سے چھپا رکھی تھی جیسے حنوط کر کے اپنی یادوں کی مہیاں سجا رکھی ہوں۔ اس میں وہ زربفت کی اچکن تھی جو اماں جان کے ابا نے دولہا بنتے وقت پہنی تھی اور ان سچی چینی کی رکابیوں کے ٹکڑے تھے جو ان کی اماں اپنے جہیز میں لائی تھیں، ان کے ابا کا فرغل تھا اور ان کے دادا کا تاریخی دوشالہ۔

جس وقت وہ ساری بازیاں ہار کے زندگی کے نابید اکٹار سمندر میں غوطے لگا رہی تھیں تو اس دوشالے کی محبت گم شدہ جزیرے کی طرح پالی تھی، ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی۔ دوشالے کا کپڑا ہر ہر تہہ پر سے پاڑ کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس کے کارچوب میں سے کئی سیر چاندی نکالی جاسکتی ہے..... یہ بات ایک دن بیوی نے سرور کو سمجھائی۔

اور دوسرے دن اماں جان اپنے بیمار بھتیجے کو دیکھنے گئیں تو وہ دوشالہ بڑی احتیاط سے نکالا گیا۔ بہو نے اس کی جگہ اپنی پرانی رضائی رکھ کر سات گھڑیوں کی تہیں پکے ٹانکوں سے سین۔ اسی طرح سے پُرانا ازار بند اوپر سے لپیٹ کر صندوق میں رکھا اور صندوق کے اوپر سب گھڑیاں، پوٹلیاں، اُبنوں کی ڈبیہ، دواؤں کی شیشیاں اور بالائی کا دونا ہر چیز یوں جمائی کہ سوائے گرد کے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اماں جان کی آنکھوں میں اب اتنا دم کہاں تھا کہ روز روز پکے ٹانکے اُدھیڑ کر دوشالے کو زمانے کی ہوا سے میلا کرتیں۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے بہو کی پرانی رضائی سینے سے لگائے جیسے جارہی تھیں۔ رات رات بھر جاگ کر اس کی حفاظت کرتیں۔ بات بات پر اونچی ہو کر بہو کو جواب دیتیں۔ بلا سے ان کا بیٹا ایک پیسے کو ترسائے۔ وہ چاہیں تو آج اپنے دادا کا دوشالہ بیچ کر ٹھٹ کریں۔ اس دوشالے کی حفاظت کے لیے ان کے سارے بھولے بسرے خواب چوکھٹ پر دھرنا دیے بیٹھے

رہتے تھے۔ اگر ذرا سی لاپرواہی سے خدا نخواستہ دو سالہ کھو جائے تو اس کے ساتھ اماں جان کا بچپن کھو جاتا، بیاہی زندگی کی اذیت ناک مٹھاس اور بڑھاپے کی تسکین آمیز کڑواہٹ... تو بہ ہے۔ اب اتنی لاشوں پر رونے کے لیے آنسو کہاں سے آئیں گے۔ اسی لیے تو انہیں اپنے پانچ بچوں کو ان کی اولاد سمیت بھول جانا پڑا تھا۔ وہاں سے جس کا خط آتا اماں جان کے لیے تڑپ رہا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اماں پر کس کی محبت خدائی کر رہی ہے.....! وہ.... تو.... اپنی دانست میں چھوٹے بیٹے کی محبت کے طعنے دیتے تھے۔ یا پھر اماں جان سے اپنا وطن نہیں چھوڑا جاتا۔ اب یہ کون جانتا تھا کہ اگر کوئی ان کی گٹھریا اٹھا کر دوزخ میں رکھ دے تو وہ وہاں بھی اسی سکون کے ساتھ صندوق سے پیٹھ لگائے تسبیح پڑھے جائیں گی۔ دن بھر میں صرف دو تین بار کسی خاص ضرورت کے لیے کھلے آسمان تلے سے گزرتی تھیں۔ اُن کی بلا سے یہ آسمان ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا۔



کبھی کبھی جمال ان کا پلو پکڑ کر ٹھکنے لگتی۔ ”دادی! ہمیں لکڑدادا کا دوشالہ دکھائیے۔“

”اچھا اچھا کسی دن دکھا دوں گی۔“ وہ ٹال جاتی کیوں کہ سامان کھول کر بیٹھتی تھیں تو جمال اور توقیر چھینا چھٹی شروع کر دیتے تھے۔ کوئی فانوسوں کے شیشے لیے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی مٹی کی ٹوٹی گڑیا پار کرنے کی فکر میں ہے۔ گھبرا کر وہ صندوق بند کر دیتی تھیں۔ اگر یوں سخی داتا بن کر بیٹھتیں تو یہ گنجائے گراں مایہ کیسے جمع ہو پاتے۔ نوادرات جمع کرنا کیسا جان جو کھم کا کام ہے۔ یہ تو کچھ وہی جانتا ہے جس نے اماں جان کی طرح اپنا عیش و آرام توج دیا ہو۔

وہ تو زندگی کے بچے گھچے دن بھی اسی طرح گزارنے کا پکا ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ ان کے بڑے بیٹے کا خط آیا۔ ان کی بڑی پوتی کا بیاہ طے ہو چکا تھا۔ اگر اب بھی اماں جان نہ آئیں تو پھر کبھی نہ آئیں۔ ان کے بیٹے سمجھتے تھے کہ اماں ٹوٹے ٹھیکروں کے نیچے سونے کی اینٹیں چھپائے بیٹھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن اماں کے سو جانے کا تار آ جائے اور سرور کے نصیب جاگ اٹھیں۔ کوٹھریا کی دولت زندگی کی طرح پیاری تھی مگر زندگی تو نہ تھی۔ کیا معلوم کل کلاں کو ان کی آنکھیں پٹ سے بند ہو جائیں اور ان کے بچے پاکستان میں بیٹھے انھیں پکارتے رہ جائیں۔

انہیں سمجھانے کے لیے حالات اپنی دلیلیں لے کر آئے اور وہ بے بس ہو گئیں۔ سرور کو تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر موقع دیا تھا۔ لپائیں چھپائیں پاسپورٹ تیار کروا لایا۔ ساتھ کے لیے ایک دوست بھی ڈھونڈ دیا۔ بہونے آنا فنا سامان تیار کر کے دالان میں رکھ دیا۔ مارے محبت کے اماں جان کے لیے خالص گھی کی کہہ کر بنا سہتی میں کھجوریں بھی تل دیں۔

اماں جان نے دوشالہ جیسی قیمتی چیز ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ کون جانے وہاں ان کے بیٹے الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر دوشالہ تھیا لیں تو....! اور جو کچھ صندوق میں بھرا جاسکا ٹھونس لیا۔ جب انھوں نے ایک بھر پور نگاہ ڈال کر کوٹھری کو تالا لگایا تو آنکھوں سے سیلاب اُمد پڑا۔ جیسے انھوں نے زندگی کی ساری ہاریں، سب جہیتیں اندر بند کر دی ہوں۔ پھر وہ بہو سے لپٹ کر خوب روئیں۔

”اب یہ کوٹھری تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔ میرے بعد تم ہی اس کی مالک ہو گی۔“

یہ بات انھوں نے بڑے سوچ بچار کے بعد کہی تھی۔ تاکہ بہو ابھی سے بے صبر نہ ہو جائے۔

”دادی آپ لکڑدادا کا دوشالہ کون سے صندوق میں رکھے جا رہی ہیں.....؟“ توقیر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”خبردار جو دادی کو جاتے وقت ستایا۔“ بہونے اس کے دو تھپڑ لگائے اور اماں جان کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ کوٹھری کی

کوئی چیز نہ چھوئیں گی۔

ریل میں بیٹھیں تو ان کا جی بالکل ہلکا تھا۔ انھوں نے کوٹھری میں یہ موٹا علی گڑھ کا تالا ڈالا تھا۔ صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر ازار بند میں کچی ٹٹولی۔ بمبئی پہنچ کر ایک ہفتہ ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ سرور کے دوست نے جانے کیا مشکل سا نام بتایا کہ اماں جان کا ”وہ“ نہیں بنا ہے۔ آخر اللہ اللہ کر کے تھکی ہاری اماں جان جہاز میں سوار ہوئیں۔ تب سرور کے دوست نے جیب میں سے ایک پوسٹ کارڈ نکال کر انھیں سُنایا۔ یہ پوسٹ کارڈ اُن کے پوتے تو قیر نے بڑی نستعلیق اردو میں لکھا تھا۔

دادی جان۔ سلام، السلام اور قدم بوسی

یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک منلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ جناب لکڑ دادا صاحب کا دوشالہ کہیں نہ ملا۔ میں نے اور جمالو نے سارا کمرہ چھان مارا۔ برا کرم بوا پسی ڈاک مُتَلّے فرمائیے کہ آپ دوشالہ کہاں رکھ گئی ہیں.....! جمالو آپ کو سلام لکھوا رہی ہے۔ فقط

آپ کا خادم

تو قیر مرزا۔ متعلم جماعت پنجم (الف)

بقلم خود

خط سُنانے کے بعد سرور کے دوست نے دیکھا کہ اماں جان اُس دوشالے کی تلاش میں کہیں جا چکی ہیں۔ تعجب کے مارے ان کا منہ گھلا رہ گیا تھا اور مُٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں..... جیسے وہ دوشالے کو پکڑے لکتی رہ گئی ہوں.....

جیلانی بانو

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- اماں جان کو دوشالے سے لگاؤ کیوں تھا؟
- 2- اماں جان دوشالے کی حفاظت کے لیے کیا کیا تدبیریں کرتی تھیں؟
- 3- ”ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی“ اس جملے کی وضاحت کیجیے۔
- 4- تو قیر کا خط صحیح الفاظ کے ساتھ لکھیے۔